نوکِ زباں
عدم

نوکِ زباں

نوکِ زُباں

عدمؔ

ادارہ فروغِ اُردو لاہور

بار اوّل : نومبر ۱۹۵۹ء

قیمت : دو روپے آٹھ آنے

پریس : نقوش پریس، لاہور۔

ناشر : محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو، لاہور

چرخ کے اجرامِ کہنہ کی تنک تابی کہاں
اور کہاں تخلیق کا چڑھتا ہوا تازہ شباب
ریزہ ریزہ ہو کے افسردہ خلا میں کھو گیا
آگیا تھا اُس خمِ ابرو کی زد میں آفتاب

عدمؔ

ہے طفلِ دل کی ضد یہ صنم کی تلاش میں
عالم کچھ اس طرح مرے عہدِ شباب کا!
جیسے کسی اُداس ستارے کے ساتھ ساتھ
سُنسان جنگلوں میں سفر ماہتاب کا

چھُپنے لگا تو ماہ یہ بولا غرُور سے
تھا مغتنم جہاں کے اندھیروں میں اپنا دم
اب کون ہے جو رات کو بخشے گا روشنی
جگنو نے مُسکرا کے کہا "بے وقوف، ہم"

یہ لمحہ کٹ گیا ہے جو دھارے سے وقت کے
یہ لمحۂ حسیں کبھی زیر و زبر نہ ہو
سویا ہے میرے زانو پہ سر رکھ کے وہ صنم
اس جاں فروز شب کی ابد تک سحر نہ ہو

ویرانیٔ گماں کو عقیدت سے سینچ کر
شادابیٔ حیات کا ساماں بنا دیا
دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا

ممکن بقدرِ ظرف نہ ہو ساقیا اگر
کچھ تو کشادہ خوئے کریمانہ چاہیئے
شبنم نے سے کیا مجھے گی گلستاں کی تشنگی
کہتی ہے ہر کلی "مجھے میخانہ چاہیئے"

اِس کارواں سرا کی منور کتاب میں
لکھا کہیں ضرور گدا کا بھی نام ہے
اے زُلفِ عنبریں ذرا لہرا کے کھیلنا
اک رات اس چمن میں مرا بھی قیام ہے

بربادیوں کے حُسن سے آباد ہے نظر!
بارانِ آبِ زر ہے دلِ داغ دار پر
یُوں نوحہ خواں ہُوں زیست کے احوال پر عدمؔ
بیٹھا ہو جیسے خود کوئی اپنے مزار پر

او بدگماں! تُو جتنا بھی چاہے گُریز کر
بندہ ترے ملاپ کا اُمّیدوار ہے
تُو چھُپ کے جائے گا بھی تو جائے گا کس طرف
کہتے ہیں جس کو زیست تری رہگزار ہے

جو رُوح بھی خُدا نے بنائی ہے نُور ہے

ہر رُوح میں اُسی کی جھلک ہے سُرور ہے

کہتے ہیں جس کو رُوح وہ ہے پرِ نورِ خُدا

کہتے ہیں جس کو جسم وہ اُس کا شعُور ہے

قرآں کے فیصلے سے تو انساں ہے امرِ حق

اور امرِ حق سے سہو کا امکاں نہیں کوئی

سہوِ بشر کو کیوں نہ کہیں پھر رضائے حق

اس کے بغیر حجّتِ عصیاں نہیں کوئی

ہمراہ لے کے شامِ خرابات کو اگر
جانا پڑا تو صبحِ ازل تک بھی جاؤں گا
بھیجو مجھے تعاقبِ ماضی میں دوستو!
میں اس گریز پا کو ابھی ڈھونڈ لاؤں گا

حد ہو گئی ہے ایسے بڑے جھمگٹے میں بھی
مالِ فقیر چشمِ خریدار کھا گئی
غائب ہے میرا نامۂ اعمال حشر میں
رحمت تری متاعِ گنہ گار کھا گئی

اِس حادثے کی اوٹ میں اے شیخِ بے خبر
خود خالقِ جمال کا ادراک پاک تھا
تہمت یُونہی جنابِ زُلیخا پہ آگئی
یُوسف کا پیرہن تو ازل ہی سے چاک تھا

•

یُوسف کی طرح یار زرے کُوئے ناز میں
کِس قیمتِ گراں پہ خریدے گئے ہیں ہم
ہم کو بھی با خُدا نہ زمانہ خرید تا
اِک مُعتبر کی "ہاں" پہ خریدے گئے ہیں ہم

سُنتے ہی اُس حسین کے انکار کی خبر
یُوں طبعِ سرکشیدہ و سرشار گر گئی
سینے میں دیکھ کر کسی آندھی کا زیر و بم
جیسے کہ دفعتاً کوئی دیوار گر گئی

مُجھ کو تری لگن، تجھے دُنیا کی تشنگی
یہ میری آگہی ہے، وہ تیرا شعور ہے
میں جس قدر قریب ہوں او مہ جبیں ترے
تُو اپنے قربِ ذات سے اتنا ہی دور ہے

تُو آگیا ہے گر مرے حُجرے میں اے امیر
مجھ کو جتا نہ شانِ امیرالامیر کی
دو چار حاتموں کی بھی خدمت نہ کر سکے
اتنی تنگ نہیں ہے طبیعت فقیر کی

یہ کوئی اس قدر بھی بڑا حادثہ نہیں
تھوڑی سی عاطفت ہے مرے دستگیر کی
اس درجہ کیا ملے گا سکوں بادشاہ کو
جس درجہ مطمئن ہے طبیعت فقیر کی

کوئے مغاں میں رات ہوئی اتفاق سے
کل شب عجیب بات ہوئی اتفاق سے
وہ گرتے گرتے میرے ہی پہلو میں آ گرے
کیا طرفہ واردات ہوئی اتفاق سے

دیکھا ہے تو نے جذبِ محبت کا معجزہ
نقطہ نہ فاش ہو سکا تفسیر بن گئی
صورت بنا رہا تھا مصوّر تری مگر
وہ اتفاق سے، مری تصویر بن گئی

اُس راہ سے چلو جو رہِ انبساط ہے
اُس کی طلب کرو، جو حقیقی نشاط ہے
ثابت قدم نہیں ہو تو نقصاں اُٹھاؤ گے
کہتے ہیں زندگی جسے اک پُل صراط ہے

اِک برمحل ادا ہی تو ہے رمزِ زندگی
جو حرف ڈٹ گیا وُہی افسانہ بن گیا
جو سوچتا رہا، رہا گمنام و نامُراد
جو بڑھ کے جل گیا وُہی پروانہ بن گیا

کرتے ہیں جس کو یاد محبّت کے نام سے

اُس ضعفِ قلب کا کوئی چارہ نہ ہو سکا

اے دوست اختلافِ طبیعت کے باوجود

ہم کو ترا فراق گوارا نہ ہو سکا

شیشہ اُٹھا کہ مصلحتِ وقت ہے یہی

بربط بجا کہ مصلحتِ وقت ہے یہی

باہیں نہ کھینچ زُلفِ مُعنبر بکھیر کر

پہلو میں آ کہ مصلحتِ وقت ہے یہی

آتے ہیں جس جگہ سے سحابوں کے قافلے
میرا گماں ہے بادہ گساروں کے شہر ہیں
کوئی خلا نہیں ہے تہی ممکنات سے
افلاک کے پرے بھی نگاروں کے شہر ہیں

حائل رہیں یہ بیچ میں کیوں عارضی حجاب
رشتہ نہ کیوں نظر کا تجلّی سے جوڑ دوں
اس سلسلے میں پہلا کرشمہ یہی کروں
ٹکرا کے جامِ گنبدِ گردوں کو توڑ دوں

مشعل جلا کے کوئے صنم کا کرو طواف
شیشہ اُٹھا کے وادیِ شاداب میں چلو
اُٹھو! بکھیر دی ہیں حسینوں نے کاکلیں
کہتی ہے رات قریۂ مہتاب میں چلو

یہ صُوفی و فقیہہ، یہ سُلطان و محتسب
یہ ملّتِ سموم و شرار اور میکدہ
یہ تاجرانِ منصب و زر، اور اِس جگہ
ساقی خُدا کا خوف۔ گنوار اور میکدہ

اب مجھ کو یہ تو علم نہیں اے مرے خدا
کون اس نگار خانے کی ضو میں حلول ہے
آتے ہیں ہر روش سے ترے ہی مجھے پیام
جس گل کو دیکھتا ہوں وہی اک رسول ہے

بلبوس رنگ و بو میں ہے یہ کون جلوہ گر
اقلیمِ صوت و ساز میں کس کا خرام ہے
جاری ہے میرے دیدۂ دل کا مطالعہ
ہر غنچہ اک کتاب ہے، ہر پھول جام ہے

وہ شہد اور شفق بھری نیندیں کدھر گئیں
مہتاب سے حسیں وہ مرے خواب کیا ہوئے
زانو تھے جن کے مثلِ صبا نرم اور خنک
اے موسمِ بہار وہ احباب کیا ہوئے

کچھ اُن کے جانے والے مراسم کی تلخ یاد
کچھ اُن کی آنے والی ملاقات کی خوشی
ہم سے خراب حالوں سے پوچھے کوئی ذرا
کیا چیز ہے خرابیٔ حالات کی خوشی

یہ کوئی اس قدر بھی بڑا حادثہ نہیں
فطرت کی ضد خمیر کے اندر رچی رہی
صرف اک قدم اُٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی

یوسف بھی گو کہ صاحبِ ادراک راز تھا
لیکن حریفِ صدقِ زلیخا نہ ہو سکا
رسوائی کے لئے بھی ہے لازم خلوصِ عشق
ہر بوالہوس جہاں میں رسوا نہ ہو سکا

یارب مُعاف کر مرے اِس حُسنِ سہو کو
یہ حُسنِ سہو، حُسنِ عقیدت کی بات تھی
میں نے ہر ایک چیز کو اپنا سمجھ لیا
مجھ کو خبر نہ تھی یہ تری کائنات تھی

ہم تشنگانِ شوق تو بھُوکے ہیں بات کے
مقصد یہ ہے کسی نہ کسی ڈھب سے بات کر
اِخلاص سے اگر نہیں گُنجائشِ سخن
اے جانِ زندگی کسی مطلب سے بات کر

چھوٹے سے اِک مذاق کو کِس احتیاط سے
اِک دلفریب فتنۂ دوراں بنا دیا
کچھ جھوٹ بچ رہا تھا حسینوں کی لُوٹ سے
اُس کو کسی نے شیخ کا ایماں بنا دیا

تجھ کو خبر بھی ہے کہ اِس انداز کا ہُما
کیوں اور کِس سبب سے تہِ دام آ گیا
میں جا رہا تھا تیرے تصوّر کے ساتھ ساتھ
رستے میں یُونہی عالمِ اجسام آ گیا

قطرہ اگر ذرا سی کرے حفظِ آبرو
دریا کی تمکنت سے زیادہ عظیم ہے
دریا کو کیا خبر کہ صدف کے ضمیر میں
ایسی بھی اِک کرن ہے جو دُرِّ یتیم ہے

مسجد کی چھب ہے اور ترا غمزۂ حسیں
زاہد یہ کاروبار بڑے بہترین ہیں
بھولے سے بھی نکلنا نہ اِس قصر سے بروں
باہر جو لوگ ہیں وہ ہمہ مُلحدین ہیں

کتنا ہجومِ رنگ ہے، کیا بکھری اں مہک
ہر ذرّہ صحنِ باغ کا اک جوئبار ہے
لیکن یہ حادثہ ہے کہ اس رُت میں بھی علامؔ
پیوست ہر کلی کے کلیجے میں خار ہے

پھرتے ہیں طائرانِ جواں شوق و خوش نظر
ہر جا نفزا، حسین، مہکتے دیار ہیں
دیر و حرم میں گھوم کے اے پیرِ میکدہ
لوٹ آؤں گا میں موسمِ ابر و بہار میں

ترکش کو دیکھ اور کوئی دلدوز تیر چُن
گنجائشیں بہت ہیں ابھی قلبِ زار میں
تُو ہاتھ دوشِ غیر پہ رکھ کر چمن میں آئے
ہم یہ ستم نہ دیکھ سکیں گے بہار میں

مِلنا ہی پڑ گیا تجھے ہم کو بھی اے حسیں
آشوب و خلفشار کے دِن بھی گزر گئے
ناگاہ صبحِ حشر نمودار ہو گئی
یکلخت اِنتظار کے دن بھی گزر گئے

اے شیخ اپنے باب میں مجھ کو یہ علم ہے
گو بادہ کش ہوں پھر بھی فرشتوں سے پاک ہوں
کچھ بھی نہیں ہوں پھر بھی یہ نسبت تو ہے ضرور
ابنِ علی کے پائے مقدس کی خاک ہوں

وہ دور کے مسائل موہوم و بے سراغ
یہ سامنے کا حادثۂ صبح و شام ہے
یزدان و اہرمن کی تو کوئی خبر نہیں
انسان ایک تلخ حقیقت کا نام ہے

بڑی والہانہ عقیدت کے ساتھ
کتھا اُن کو اپنی سُناتا گیا
وہ گھبرا کے آنچل جھٹکتے گئے
میں لہرا کے بربط بجاتا گیا

ہر اک ساز میں اُس کی آواز ہے
ہر اک پھُول میں اُس کی تصویر ہے
اُسے ڈھونڈنے کا تکلّف ہی کیا
خُدا کو تو خود شوقِ تشہیر ہے

مَیں بیٹھا ہُوں جام و صُراحی لئے
صبا ! آج تُو میرا اِک کام کر
یہ تنہا خرامانِ صحنِ چمن
اِنھیں لے ہی آ، اس طرف تمام کر

اِسے چھوڑ دو اس کے میلان پر
وگرنہ وُہی بات ہو جائے گی
خِرد کو پُرانی کِتابیں نہ دو
خرابِ روایات ہو جائے گی

صُراحی کی آواز میں حُسن ہے
پرندوں کی پرواز میں حُسن ہے
وُہی ہے ہر انداز میں جلوہ گر
اُسی کا ہر انداز میں حُسن ہے

اری! او ستارہ جبیں جوگنو!
تُمھیں جس سے شوقِ مُلاقات ہے
کہاں خانقاہوں میں اُس کا گُزر
وہ جوگی تو رہنِ خرابات ہے

رفتہ رفتہ اُس حسیں کو قتل کرنا آ گیا
ہولے ہولے مانگ میں سیندور بھرنا آ گیا
اُس کی خود بینی کو بھڑکانے کی خاطر قدرتاً
عاشقوں کو بھی جگر پر ہاتھ دھرنا آ گیا

مانگ میں سیندور، پیشانی پہ بندی، من میں لے
گیسوؤں میں بند کلیاں، انکھڑیوں میں شہد رس
پاس اس دیوی کے مت جانا، اگر جاں ہے عزیز
اس کو مس کرتے ہی جل جاؤگے اے اہلِ ہوس

چرخ کے اجرامِ کُہنہ کی تنک تابی کہاں
اور کہاں تخلیق کا چڑھتا ہوا تازہ شباب
ریزہ ریزہ ہو کے افسردہ خلا میں کھو گیا
آ گیا تھا اُس خمِ ابرو کی زد میں آفتاب

مَیں بتاؤں کس طرح تخلیقِ میخانہ ہوئی
اور کیسے جگمگا اُٹھی غمِ ہستی کی رات
گر گئی سجدے میں اُس زُہرہ جبیں کو دیکھ کر
جا رہی تھی آسماں پر چاند تاروں کی برات

خرد کی حیرتیں ہیں سرگرفتہ
جنوں کا زمزمہ آتش بجاں ہے
عمل اور سوچ میں ہے فرق کتنا
کنارا چپ ہے اور دریا رواں ہے

خرد کی تلخیوں سے لَو لگائیں
کہ نادانی کے سادہ پھول رولیں
کتابِ زندگی پیشِ نظر ہے
کہو! اب کون سا باب اس کا کھولیں

پیالہ دے شعورِ آگہی کا
اندھیرے راستہ روکے کھڑے ہیں
نگاہِ ہوش کیا افشا کرے گی
بڑے پردے جمالوں پر پڑے ہیں

ذرا دیکھو تو کیا دلچسپ ناوک
مقاصد کے کلیجے میں گڑے ہیں
جواب اُن ہی کے مانگے تھے کسی سے
نشاں جن جن سوالوں پر پڑے ہیں

اندھیرے بھی ہیں کیا دلکش اندھیرے
جو میخانے کی چوکھٹ پر جڑے ہیں
نگاہیں چُور ہیں نیندوں سے اُن کی
گھنیرے بال گالوں پر پڑے ہیں

مقامِ بدگمانی سے چلی تھی
ہوائے بے خودی میں کھو گئی ہے
فراستِ موسمِ گُل تک پہُنچ کر
گریبانِ دریدہ ہو گئی ہے

جوانی روشنی ہے اِس نگر کی
محبت کائناتِ زندگی ہے
خُدا کا بُت بنا کر اِس میں رکھ دو
مرا دل سومناتِ زندگی ہے

وہ بانکی آنکھ متانوں کی خاطر
ذرا وجہِ شکیبائی ہوئی ہے
بڑی بے لذّتی سے جی رہے تھے
خُدا کا شُکر رُسوائی ہوئی ہے

پیالے کس لئے شق ہو گئے ہیں
اُجالے کس لئے غش کھا گئے ہیں
ابھی تو فصلِ گُل کی ابتدا تھی
ابھی سے پھول کیوں مُرجھا گئے ہیں

بِلا اسبابِ ظاہر باسلیقہ
ہماری سمت بھی جام آ رہا ہے
خُدا کا آسرا تم دے گئے تھے
خُدا ہی آج تک کام آ رہا ہے

ہماری تشنگی سے آج ساقی
شرابوں کا جگر بھرّا رہا ہے
نگاہوں سے ذرا سیراب فرما
کہ میخانہ تو بجھتا جا رہا ہے

جوانی بیش قیمت حادثہ ہے
محبّت خوب صورت دردِ سر ہے
ابد تک کاش منزل تک نہ پہنچیں
مرا محبوب میرا ہم سفر ہے

مرے جینے کی بے مقصد تمنّا
اچانک حرفِ مطلب ہو گئی ہے
تُمھاری اِک نظر ضائع ہُوئی ہے
مری دُنیا مرتّب ہو گئی ہے

مرے اعصاب کی تپتی جہنّم
کِسی ٹھنڈے کُنوئیں میں سو گئی ہے
بس اب زُلفِ پریشاں کو سنبھالو
مرا ایمان ہے شب ہو گئی ہے

ابد سے جا ملا ہے غم ازل کا
کہانی اب کہانی ہو گئی ہے
ترے ملنے کی مبہم سی توقع
حیاتِ جاودانی ہو گئی ہے

مرے شیشے کے تھمنے سے اچانک
تحرّک میں ترا جام آ رہا تھا
تڑپ کر میں نے توبہ توڑ ڈالی
تری رحمت پہ الزام آ رہا تھا

میرے مذہب میں تو حلال ہے مے
پَر اُسی وقت جب تُو ساقی ہے
وہ خُدا بھی خُدا سہی لیکن
تُو مرا رَبِّ اشتیاق ہے

کاش اک روز تیرے کُوچے میں
یُوں گروں لڑکھڑا کے مست و خراب
تُو یہ پُوچھے کسی سے کون ہے یہ
اور کیوں پی گیا ہے اِتنی شراب

یہ میکدے کی گلی خانقاہ ہے میری
یہ مے نہیں ہے مگر رسم وراہ ہے میری
وہ جس کی رُو سے برابر ہیں دوست اور دشمن
خُدا گواہ وہ خُوئے نگاہ ہے میری

یہ امتیاز نہیں ظاہری بصارت سے
یہ امتیاز فقط باطنی جمال سے ہے
وہ دیر و کعبہ ہوں ، یا خانقاہ و میخانہ
غرض تو صرف ہمیں یار کے وصال سے ہے

گُناہ پر نہیں گو اختیار کچھ اپنا
مگر گُناہ کی عظمت کو جانتے ہیں ہم
ہے انتہائے محبّت کہ تیری لغزش کو
ادب سے اپنی ہی تقصیر مانتے ہیں ہم

مطالعے کے لئے تابِ دید لازم ہے
بلا خلاف یہ شعلہ فگن کتاب نہ کر
شراب پی کے مجھے آنکھ کھول لینے دے
ابھی چمکتے ہوئے رُخ کو بے نقاب نہ کر

اُڑے ہیں زہرہ جبینوں کے رُخ سے یُوں پردے
شبِ سیاہ شبِ ماہ بنتی جاتی ہے
جو بات بن نہ رہی تھی مِری دُعاؤں سے
وہ اتفاق سے ناگاہ بنتی جاتی ہے

تِری نگاہ سے شاید بجا اُتر آئے
مِری نظر سے برابر خراب اُترتی ہے
اُتارتا ہوُں جو تصویر اپنی حالت کی
وہ اتّفاق سے اکثر خراب اُترتی ہے

مثالِ شبنم و رنگ و سحاب اُترتی ہے
شراب بنتی نہیں ہے، شراب اُترتی ہے
نزُول ہوتا ہے یُوں ذہن پر معارف کا
کہ آسمان سے جیسے کتاب اُترتی ہے

بہ اتّفاق اگر آ بھی جائے بھُولے سے
خُدا گواہ کہ یُوں جھُوم کر نہیں آتی
لپٹ بھی جاؤ عدمؔ آج اُن کی زُلفوں سے
یہ رات وہ ہے جو بارِ دگر نہیں آتی

اگرچہ عادتِ منّت کشی نہیں ہم کو
خلافِ طبع یہ تکلیف بھی اُٹھالیں گے
ابھی بہ عالمِ تفریح تم سے کیا مانگیں
کبھی بوقتِ ضرورت تمھیں صدا دیں گے

ذرا سا آپ تعاون کریں تو ممکن ہے
مرا یہ سلسلۂ مشکلات کٹ جائے
حضور چاندسی باہیں اگر کریں عُریاں
بعید کیا ہے یہ تاریک رات کٹ جائے

کھلی ہے ہم پہ بھی تھوڑی سی اصلیت اُس کی
ہمیں بھی تھوڑا سا اِس طفل سے فراغ ہوا
ہمیں تو کہتا تھا اُس سے نہ میں ملوں گا کبھی!
کسی کو دیکھ کے دِل کتنا باغ باغ ہوا

مرے مزاج میں بھی ہو رہی ہے تبدیلی
مرا شعور بھی بیدار ہوتا جاتا ہے
قریب دیکھ کے آج اِک حسیں گوالن کو
مجھے بھی عشق کا آزار ہوتا جاتا ہے

یہ اس قبیل کی فن کاریوں کے ماہر ہیں
یہ اس قبیل کی بیداد کب نہیں کرتے
جنابِ داورِ محشر! یہ میری فردِ عمل؟
ذرا فرشتوں کو حضرت اطلب نہیں کرتے

جاتا تھا جس کے در پہ تجھے بھی میں چھوڑ کر
وہ آ کے ایک دن مرا در کھٹکھٹائے گا
یا رب ترے جہان ہیں، تُو خود ہی عدل کر
ایسا بھی دَورِ قحطِ محبّت کا آئے گا

ہماری قوّتِ بازو سے رزق اُگتا ہے
زمیں کے پیٹ سے سونا کشید کرتے ہیں
وزیر؟ اُس کی تو اوقات ہی بھلا کیا ہے
ہمارے مال پہ سلطاں بھی عید کرتے ہیں

نہیں ہیں کچھ بھی تو دہقاں تو ہیں حیثیت سے
غریب ہو کے بھی عالی وقار ہیں ہم لوگ
ذرا رُکو، تمھیں چاندی سا دودھ پیش کریں
مسافرو! بڑے خدمت گزار ہیں ہم لوگ

قیامت کے مُعیّن دِن سے پہلے
ہزاروں حشر برپا ہو گئے ہیں
خُدا کے واسطے وعدہ وفا کر
کئی امروز فردا ہو گئے ہیں

یہ کیسے حادثے سرزد ہُوئے ہیں
یہ کیسی وارداتیں ہو گئی ہیں
تماشا تیرگی سے ڈر رہا ہے
نگاہیں روشنی میں کھو گئی ہیں

کل وہ تھے تو اور ہی تھا کچھ سماں
آج وہ شادابِ جولانی نہیں
آج ساحل بھی ہے غمگیں اور اُداس
آج دریا میں بھی طُغیانی نہیں

ہے گھٹا کی چال بھی کچھ دلربا
اور ہوا کا گام بھی مستانہ ہے
میری توبہ پہ نہ چھینٹا آ پڑے
دَور میں آیا ہوا پیمانہ ہے

چھپ چھپ کے یہ کیا رسم و رہِ عشق مری جاں
یہ شعلۂ خاموش بھڑک جائے تو بہتر
تعبیر جسے کرتی ہے رُسوائی سے دُنیا
وہ چاندنی ہر سمت چھٹک جائے تو بہتر

تُو جانِ خرابات ہے اے پریم کی جوگن
مندر سے نکل پہلوئے میخوار میں آجا
سنگین دریچوں سے نہ کر ہم کو اشارے
ملنے کا ارادہ ہے تو بازار میں آجا

کس حُور نے اعصاب پہ چھڑکی ہیں شرابیں
کس خُلد کے آغوش میں یہ رات ہوُئی ہے
سُورج کے جگانے سے بھی اُٹھتے نہیں میکش
کیا ٹُوٹ کے اِس مرتبہ برسات ہوُئی ہے

یہ چاند، یہ چشمہ، یہ چمن، سبز ہوائیں
خوشبُو کے دریچوں میں ترنّم کی صدائیں
آنکلیں اگر آج ادھر خضر و مسیحا
دو گھُونٹ انھیں اپنے پیالے سے پلائیں

ایسے نہیں اوراق اگر رنگ کے کھلتے
تحقیق کی تھوڑی سی انھیں آنچ دکھا دو
مالی کا ارادہ ہے کہ غنچوں کو مسل کر
گلزار کو گلزار کی تفسیر بنا دو

ہونے کو ہے بیدار گُل و مل کی سماعت
اب وقت ہے زنجیرِ عدالت کو ہلا دو
اے بلبلو! یوں چیخو! کہ کھل جائیں معانی
بہکے ہوئے الفاظ کو تقریر بنا دو

اُمّید نہیں ہوتی جہاں اُن کے قدم کی
ہوتی ہے وُہیں اُن سے مُلاقات ہمیشہ
ویران ہیں اِنساں سے روایات کے مندر
آباد ہیں رندوں سے خرابات ہمیشہ

کچھ باعثِ ہیجانِ خیالات تو ہوگا
کچھ حجّتِ مدہوشیِ جذبات تو ہوگی
وہ تو یہی کہتے ہیں کوئی بات نہیں ہے
لیکن ذرا سوچو تو کوئی بات تو ہوگی

کیسے کیسے سلیم اندازے
کیا غلط گاہ گاہ ہوتے ہیں
کیسے کیسے عظیم بندوں سے
کیسے کیسے گناہ ہوتے ہیں

کچھ قدح نوشیاں بہ صحبتِ گل
کچھ غزل خوانیاں ضروری ہیں
اِس خِرد کے خراب خانے میں
چند نادانیاں ضروری ہیں

تیری تسبیح میں گُہر دو صد
میری مالا میں صرف دو دانے
دیکھنا یہ ہے دیکھنے والا
کِس کے دھاگے کی قدر پہچانے

فرش تو بچھ چکا ہے چندن کا
کب پڑھے گا نماز دیوانے
شمع کی زندگی دراز نہیں،
جل بھی جا بدنصیب پروانے

اُن کے جانے سے دم نکلتا ہے
اُن کے آنے سے جان پڑتی ہے
اُن میں اور ہم میں فاصلہ ہی کیا
زندگی درمیان پڑتی ہے

گلشنِ راز کے پرندے ہیں
بزمِ اسرار کے قلندر ہیں
کھائیں گے کیا فریب ہستی کا
ہم عدم پار کے قلندر ہیں

آنکھ جب تک نہ ہو نم آلودہ
اِہتمامِ سکُوں نہیں ہوتا!
کاش یہ دِل، یہ ضبط کا مرقد
ایک دِن پھُوٹ کر رَوتا

اہلِ دل ہیں کہ عاصیوں سے بھی
خیر کی رسم و راہ رکھتے ہیں
بے ہُنر ہیں کہ صرف لوگوں کی
خامیوں پر نگاہ رکھتے ہیں

عمرِ رفتہ کو ڈھونڈنے والے
اب تو دھوکا وہ کھا نہیں سکتی
تُو ہی اب اُس کے پاس جائے گا
وہ ترے پاس آ نہیں سکتی

آج کچھ اتفاق ایسا ہُوا
ہم نے مانی نہ یار کی باتیں
ورنہ کِس قدرتی طریقے سے
بن رہی تھیں بہار کی باتیں

سرکشی دیکھتا ہے اور پھر بھی
پیکرِ بخشش و خطا ہے تو
کتنے اُلجھے ہوئے فقیر ہیں ہم
کتنا سُلجھا ہوا خُدا ہے تو

زرد مت کر ملال سے چہرہ
رنگ پی اور گلبدن ہو جا
حال و فردا کا چھوڑ اندیشہ
لے اُٹھا جام اور مگن ہو جا

ماسوا تُو ہے، ماورا ہے تُو
کس طرح چھُپ سکے خُدا ہے تُو
باقی ہر چیز درمیاں کی کڑی
اِبتدا تُو ہے، اِنتہا ہے تُو

گو مرے دامِ صدق میں ساقی
تیتری دُھن کی آ نہیں سکتی
میں بھی وہ تلخ حادثہ ہوں مگر
جس کو دُنیا بُھلا نہیں سکتی

زندگی بھی ہے وہ حسین چبھن
جانا چاہے تو جا نہیں سکتی
موت کا نام بھی ہے مجبوری
آنا چاہے تو آ نہیں سکتی

آپ کے قُرب کے تمنّائی
کیا کسی روز کامراں ہوں گے
ذکرِ محشر مُبالغہ تو نہیں؟
واقعی آپ بھی وہاں ہوں گے؟

آپ کا ہجر راحتِ جاں ہے

جاں سے گزرے تو بے نشاں ہوں گے

آپ آتے نہیں غنیمت ہے

آپ آئے تو ہم کہاں ہوں گے

بُلبلو! کتنے سادہ لوح ہو تُم

کیسے اُلٹے حساب کرتے ہو

خار کی نوک کو لہو دے کر

اِنتظارِ گلاب کرتے ہو

تھا رگِ جاں میں زخمِ مُشتاقی
وہ اُسی زخم کے طبیب رہے
میں اُنھیں مَس بھی کر سکا نہ کبھی
وہ مرے اس قدر قریب رہے

•

زخم کب کِھل کے پھول ہوتے ہیں
قرض مُشکل وصول ہوتے ہیں
اِک بہانہ ہے خود فریبی کا
کِس کے سجدے قبول ہوتے ہیں

•

کیا حسیں طرز ہے تلافی کی
کیا عجب اندمال ہوتے ہیں
لیجئے یہ ادا بھی خوب رہی
حشر میں بھی سوال ہوتے ہیں

ہے یہی سادگی تو وہ فتنہ
جس سے دُنیا تباہ ہوتی ہے
اور ہوتا ہی کیا ہے او ظالم!
ایک ہی تو نگاہ ہوتی ہے

جیسے سُونی سحر بیاباں کی
جیسے شامِ سیاہ ہوتی ہے
زِندگی یُوں ہے پارساؤں کی
جیسے اِک خانقاہ ہوتی ہے

تھا مقدّر میں ایک اور سفر
اِس لئے شہرِ مدّعا نہ مِلا
ہم پہنچ تو گئے تھے منزل پہ
اِتّفاقاً تِرا پتا نہ مِلا

بھول کوئی جدید ہو جاتی
بیقراری شدید ہو جاتی
تم نے اچھا کیا نگاہ نہ کی
عادتِ بازدید ہو جاتی

لو! میں دل کا چراغ دیتا ہوں
اس کی تنویر بے ثبات نہیں
کتنی شمعیں جلاؤ گے صاحب
زندگی گرمیوں کی رات نہیں

آؤ باہنوں میں ڈال دو باہنیں
کس لئے ہچکچا رہے ہو تم
ایک لمحہ تو ہنس کے بات کرو
ایک مدّت خفا رہے ہو تم

کیا حسیں حادثہ ہے بنتا ہوا
کیا عجب بات ہوتی جاتی ہے
زندگی کے نظام میں حائل
آپ کی ذات ہوتی جاتی ہے

آدمی زاد کا تو ذکر ہی کیا
وقت و ماحول کی بھی باس نہ ہو
آج اِک بات تُم سے کرنی ہے
دیکھنا کوئی آس پاس نہ ہو

آ ! ہماری پسند ہوتا جا
او حسیں سربُلند ہوتا جا
شہر یارا ، گدا کی صحبت سے
دو گھڑی ارجمند ہوتا جا

ہو سکے تو بڑی عقیدت سے
تا ابد اُن پہ جاں نثار کریں
اُن طوالت پسند زُلفوں سے
کیا تقاضائے اختصار کریں

شمس تبریز کی نظر کے بغیر
مولوی صاحبِ کتاب نہیں
عشق تابانیٔ فراست ہے
عشق نادانیٔ شباب نہیں

عشق ہے اپنا جوہرِ ذاتی
عشق اِک فرضِ منصبی تو نہیں
آپ کتنے بھی خُوب صُورت ہوں
آپ معشوق ہیں، نبی تو نہیں

غُنچہ و گُل کی کیا حقیقت ہے
غُنچہ و گُل کی داستاں کے سِوا
آپ کس کی تلاش میں گُم ہیں
باغ میں کچھ نہیں خزاں کے سوا

تازہ دم ہو کے پھر سے چلنا ہے
تھم گئے ہو تو کوئی بات نہیں
موت سے خُوش ہو کس لئے اتنے
قبر تو مقصدِ حیات نہیں

قبر تک جسم کی تگ و دو ہے
گرد کو سست گام کہتے ہیں
رُوح کرتی ہے جو سفر اُس کو
چاندنی کا خرام کہتے ہیں

ہو کے موجود بھی نہیں حاضر
پاس رہ کر بھی دور ہیں ساقی
چاندنی، رُوح، زمزمہ، خوشبو
کس چمن کے طیور ہیں ساقی

دوستی کے یہ طرز و طور نہیں
کر مگر اس قدر تباہ نہ کر
ہاتھ کب جوڑتے ہیں ہم تجھ سے
اے غمِ زندگی تباہ نہ کر

سیاہ رات کی تنویر کے لئے ساقی
کہیں ایاغ، کہیں گُل چراغ جلتے ہیں
مگر وہ میرا شبستانِ دل بھی کیا شے ہے
جہاں ازل سے محبّت کے داغ جلتے ہیں

کُوزہ گروں کو خود بھی نہیں اس کی کچھ خبر
کُوزے بنا کے کتنا ستم ڈھا رہے ہیں وہ
تلّاشِ مے کشوں کی مدارات کے لئے
شاہوں کی گردنوں کے سبُو لا رہے ہیں وہ

ہُوا جو قطرے سے ناراض بے سبب دریا
تو بولا غیض سے، "چنڈال دیکھا جائے گا"
کہا حباب نے بھی سر ادب سے خم کر کے
"یہ بات ہے، تو بہر حال دیکھا جائے گا"

تِری گلی ہی میں دیکھا ہے اِن کو آوارہ
نسیم و نُزہت و نکہت عزیز ہیں تیری
چمن کی عارضی چھب سے گدا کو کیا لینا
کہ پائدار بہاریں کنیز ہیں تیری

ہم اپنے رازِ محبت کو مشتہر کر کے
حمایتِ رسن و دار کرنے والے ہیں
جو بچ گئی تھی تری حفظِ آبرو کے لیئے
وہ اک خطا بھی ہم اے یار، کرنے والے ہیں

اُسی کے خُلقِ خطا بخش کو محبت سے
گواہِ صحتِ کردار کرنے والے ہیں
سنا لیا ہے عدمؔ اُس کی رحمتوں کو بہت
اب اپنے جُرم کا اقرار کرنے والے ہیں

مثالِ سُنبل و ریحاں اگر نہیں ملتے
مثالِ ناوک و پیکاں ہمیں ملو تو سہی
قسم خُدا کی رگِ جاں بھی ایک بستی ہے
قریبِ شہرِ رگِ جاں ہمیں ملو تو سہی

ملے خبر تُجھے انوارِ باطنی کی اگر
تو رنگ پڑنے لگے زرد آفتابوں کا
تُو میرے ہاتھ سے پی کر تو دیکھ اک ساغر
اِس ایک بُوند میں انبار ہے کتابوں کا

مجھے تو چھوڑ، ذرا سی نہ کر مری پروا
مرا مزاج ترے ہجر سے نکلتا ہے
خدا کے واسطے رخصت نہ ہو گلستاں سے
ترے بغیر بہاروں کا دم نکلتا ہے

شکاریوں کی مسلّم ہے قوتِ بازو
مگر یہ صیدِ جری ہر گماں سے بھارا ہے
غمِ زمانہ مجھے کر سکے گا کیا زخمی؟
کسی نے آبِ رواں کو بھی تیر مارا ہے؟

تُو ہو کے واقفِ احوال، اے پری زادے
برت رہا ہے فقیروں سے جورِ سادہ بھی
ہمارے سہوِ نظر کو ہوس کا نام نہ دے
نگاہ پڑتی ہے کم بخت، بے ارادہ بھی

ہمیں جفا کی بھی سرکار! کچھ ضرورت ہے
ہمیں، حضور! فقط حرصِ التفات نہیں
تعلقات نئے ہوں تو یُونہی ہوتا ہے
یہ بدظنی کوئی بیگانگی کی بات نہیں

جو تُو سمجھتا ہے ناداں ایسی بات نہیں
یہ کائنات کسی کی کنیزِ ذات نہیں
مجھے یہ کہہ کہ محبّت نے جامِ زہر دیا
کسی کے پاس علاجِ غمِ حیات نہیں

خرید لائے گی یُوسف کو پھر زُلیخا کوئی
دوبارہ عشق کے آزار نوجواں ہوں گے
وہ وقت دُور نہیں جب خزاں کے سینے سے
بہارِ رفتہ کے انفاس پھر رواں ہوں گے

خزاں کی تیرہ و تاریک رہگزاروں میں
چراغِ شیشہ و بربط جلائے ہیں ہم نے
مزارِ غنچہ و گُل کے نشاں نہ تھے پیدا
نسیمِ صُبح کو رستے دکھائے ہیں ہم نے

یہ میرے علم کے فقدان کی دلیل سہی
یہ میرے حُسنِ عقیدت کا اک بہانہ سہی
سُنا تو ہے کہ خُدا کا وجُود برحق ہے
اگر یہ بات غلط ہے تو پھر خُدا نہ سہی

یہ حادثہ ہی تو ہے معجزہ عقیدت کا
یہ معجزہ ہی تو رحمت مرے خدا کی ہے
بکھر گئی ہے کچھ اس دلکشی سے وہ کاکل
کسی نے جیسے کڑی دھوپ میں دعا کی ہے

مجھے تو اے دلِ ناداں، یقیں نہیں آتا
حقیقتاً تجھے تکلیف دلربا دیں گے
محافظانِ چمن سے یہ بدگمانی کیوں
محافظانِ چمن کیا، چمن جلا دیں گے

یہ تیری بارگہہ ناز ہے فقط پیارے
جہاں بھٹکنے کی درویش کو مجال نہیں
خُدا، خُودی کے تصوّر کی آخری حد ہے
خُدا سے ملنا تو ایسا کوئی محال نہیں

جہاں کے گرم حوادث میں گھومنے والے
دِلوں کے رنگ دوارے ترے لئے تو ہیں
نہیں پسند تلاطم تو گھاٹ پر آجا
عزیزِ من! یہ کنارے ترے لئے تو ہیں

شکار خود نہیں کرتے کبھی پری زادے
وہ اپنے ترکشِ غمزہ میں تیر رکھتے ہیں
عدمؔ جنوں سے کہو عقل دوست ہو جائے!
کہ شہر یار عموماً وزیر رکھتے ہیں

صدائیں خسرو و سلطاں کی یہ سُنیں نہ سُنیں
قلندروں کی صدائیں شتاب سُنتے ہیں
صدا تو دو، درِ خُوباں پہ نصف شب یارو!
مُجھے یقیں ہے، یہ آوازِ باب سُنتے ہیں

گُزرنا پڑتا ہے گو اِس دیار سے سب کو

مگر یہ کہہ دو، کوئی اب نہ بے سبب گُزرے

ہے باغِ دل میں بہاروں کی یاد سوئی ہُوئی

خزاں بھی گُزرے اِدھر سے تو با ادب گُزرے

یہ آدمی ہی تو ہے اک جوابِ یزداں کا

کہاں ہے دُوسرا اُس کا جواب اے ساقی

مشیرِ بحر، اگر ہو تو کچھ بعید نہیں

مُریدِ بحر نہیں ہے حباب اے ساقی

ترے لبوں کی لکیروں میں علم و عرفاں کی
کھلی ہوئی ہے درخشاں کتاب اے ساقی
اُٹھا نہ جام کہ صرف اک ترے تبسّم سے
پہنچ چکی ہے رگوں تک شراب اے ساقی

مجھے شریک نہ کر اُس گروہ کے اندر
وہ اور ہوں گے خُودی کو جو توڑ کر آئے
میں خود نہ آیا تھا ساقی کہ خود چلا جاؤں
مجھے بُلایا تھا جس نے وہ چھوڑ کر آئے

کچھ اِس طرح سے بُجھا ہے مزاجِ بادِ صبا
کہ جیسے غُنچہ و گُل کی دُعا بھی خام گئی
کِسی کو اب کوئی شکوہ نہ ہوگا دُنیا سے
سُنا ہے محنتِ فرہاد بھی حرام گئی

بغیرِ شرکتِ دل، ہو ادا تو کیسے ہو
یہ چیز تو نہیں وہم و خیال کا پرتَو
تری نماز بھی زاہد! درست ہو جائے
پڑے اگر کسی زُہرہ جمال کا پرتَو

بڑی خوشی سے دو عالم پہ حکمرانی کر
مری طرف سے تجھے اختیار ہے ساقی
دلوں کو دام میں لانا ہی شہریاری ہے
خلوص سب سے بڑا اقتدار ہے ساقی

خودی بھی ایک ضرورت ہے اہلِ حاجت کی
گدا ضرور ہیں، لیکن سوال مند نہیں
نہ خوئے باب زنی ہو تو کیا علاج کروں
میں جانتا ہوں، ترا باب مجھ پہ بند نہیں

طلب کے وقت سُنا ہے زُباں نہیں کھلتی
طلب کے وقت فقیروں کو حال آتا ہے
گداگری کی طبیعت کو خُو تو ہے، لیکن
بڑے حجاب سے لب پر سوال آتا ہے

تُو خُلق و صدق کی قدروں کا بھی نہیں قائل
زیادہ تجھ سے کوئی انور و مُنیر نہیں
پُہنچ گیا ہے تو زاہد خُدا کے اِتنا قریب
ترے وجُود میں انسان کا ضمیر نہیں

مدّتوں کی نامرادی اور چبھن
ایک لمحے میں کنارا کر گئی
جب نظر ڈالی کسی نے لُطف سے
یُوں ہُوا محسوس جھولی بھر گئی

محوّیت کی اک ذرا سی آن میں
دل میں اُس مہ وش کا پھیرا ہو گیا
ہم نے جب بھی صدق سے سجدہ کیا
ایک رکعت میں سویرا ہو گیا

قیامت کا دِن ہے تو پھر کیا ہُوا
یہاں بھی مرے جان و ایمان لو
مجھے دیکھ کر رنگ کیوں اُڑ گیا
ذرا اپنی تصویر پہچان لو

جہانِ رنگ و بُو کی چلمنوں میں
کوئی تو عشوہ گر ہے، جو چُھپا ہے
نہیں ہے تو نہ ہو، میری بلا سے
مجھے محسوس ہوتا ہے خُدا ہے

آپ جب تک نہ التفات کریں
عیب یکسر ہُنر نہیں ہوتے
زندگی تو طویل مُدّت ہے
چار پل بھی بسر نہیں ہوتے

تین چیزوں کو مانتا ہوں میں
ایک مَیں، ایک آپ، ایک خُدا
ماسوا اِس کے اور کیا ہو گا
اور ہو گا بھی کچھ تو ریب و ریا

خرد کے وسوسوں کی خانقاہوں میں نہیں ہوتا
جنوں کے زمزمہ انگیز میخانوں میں رہتا ہوں
کنارے پر نہ کیجے گا زیادہ جستجو میری
کہ میں لہروں کا متوالا ہوں طوفانوں میں رہتا ہوں

ارادوں کے درخشاں آئینے اپنی چمک کھو کر
خیالوں کے غم آلودہ شبستاں بنتے جاتے ہیں
بڑا دلچسپ ہے انساں کی کمزوری کا افسانہ
جہاں یہ تھک کے رہ جاتا ہے یزداں بنتے جاتے ہیں

گداز قربتِ اصنام سے دل پگھلے جاتے تھے

نفس صہبا، بدن زر بار تھے کل شب جہاں میں تھا

گماں ہوتا تھا شاید زندگی پھولوں کا گجرا ہے

گلوں کے اِس قدر انبار تھے، کل شب جہاں میں تھا

ہیں کتنی بدگمان و مضطرب یہ دو حسینائیں

مری مانیں تو اِن کو مستقل آرام ہو جائے

تری چشمِ غزالیں میں اگر اک مرتبہ ڈوبے

شریعت رنگ بن جائے، مشیت جام ہو جائے

یہ وہ بت خانۂ حیرت ہے آزردہ کھلونوں کا
کہ جس کے خال و خط مغموم اور بیمار ملتے ہیں

خردمندوں سے ہیں اس واسطے پرہیز کرتا ہوں
کہ ان میں اختلالِ ہوش کے آثار ملتے ہیں

اُسے کیا معرفت ہوگی سوائے خود فریبی کے
وہ سجدہ جو حدودِ ہوش تک محدود ہوتا ہے

خدا کا نام تو ہے مُفت میں بدنام اے ساقی
عبادت کرنے والا آپ ہی معبود ہوتا ہے

مرے دیوانہ پن سے میری آگاہی ٹپکتی ہے
مری تصویر میں شامل تری تصویر ہے ساقی
سمجھنے والے اس حد تک تو اب تسلیم کرتے ہیں
مری مستی تری برہم شدہ تقدیر ہے ساقی

دلِ کونین میں کیسے ترازو ہو سکے گا یہ
مرے ترکش میں صرف اک زنگ خوردہ تیر ہے ساقی
مرے ماحول کو تبدیل کر دے اپنی آنکھوں سے
سُنا ہے آدمی ماحول کی تعمیر ہے ساقی

مسندِ شیریں تھا جس ایوان میں
اُس جگہ اب مرقدِ فرہاد ہے
ختم ہے اُس کی جفا کا سلسلہ
مہربانی آخری بیداد ہے

آنکھ وہ بھی بے تحاشہ سُرمہ سا
ریش، وہ بھی اس قدر گنجان سی
شیخ صاحب اور سب کچھ چھوڑیئے
شکل پیدا کیجیے انسان سی

ہیں عقل و جنوں دونوں رستے ترے کوچے کے
یہ چیز بھی نورانی، وہ چیز بھی نورانی
خرمن کی مہک میرے وجدان کا گلدستہ
بجلی کی چمک میرے ادراک کی عریانی

دراصل وہی تو ہے تمہید تعارف کی
کہتے ہیں نگاہوں کی جس چیز کو حیرانی
آتی ہے صدا اُس کی ایسے مجھے باطن سے
بہتا ہو کہیں جیسے جھرنوں کا حسیں پانی

اب تو گل بوٹے نظر آتے ہیں کچھ
ورنہ دل سادہ سا اک پیمانہ تھا
زندگی اُس کی توجہ کے بغیر
دُور تک پھیلا ہوا ویرانہ تھا

رہبروں کی بات کو ہرگز نہ سُن
ان کو اپنے تابعِ احکام کر
اپنا رستہ خود بنا مثلِ صبا
چل نہ رہگیروں کا دامن تھام کر

کون لکھ سکتا ہے یہ حرفِ ادق
اپنی قسمت آپ ہی ارقام کر
آخرت سازی ہے مردوں کا چلن
حال کو آئینۂ انجام کر

ہے جنوں بھی ایک ضدّی بچپنہ
عقل بھی اک وحشتِ طفلانہ ہے
کہہ رہا تھا رات خود پیرِ مغاں
زندگی اک لغزشِ مستانہ ہے

کس کو تحقیقِ تجلّی کا ہے ادراک یہاں
کون اس عشوۂ مرغوب کو پہچانتے ہیں
عشق اک اندھی عقیدت ہے وہ جس سے ہو جائے
کتنے عاشق ہیں جو محبوب کو پہچانتے ہیں

زخم کتنا بھی ہو گہرا نہیں اتنا مُہلک
وقت کتنا بھی ہو دشوار گزُر جاتا ہے
کیوں پریشاں ہیں نہ معلوم یہ جینے والے
جس کو جینے کی نہ توفیق ہو مر جاتا ہے

شوق کو زنگ نہ کھا جائے تو ہے نکہتِ گُل
غم کے احساس میں بھی ایک خوشی ہوتی ہے
دیکھئے جان نکلتی ہے کہ ارماں دل کا
زندگی حلق میں اٹکا ہُوا اک موتی ہے

اِک مقام ایسا بھی آتا ہے مناسب ہے جہاں
توڑ کر رشتۂ پا، موجِ صبا ہو جانا
جس جگہ میں تجھے چپکے سے اشارہ کر دوں
تُو وہیں قافلے والوں سے جُدا ہو جانا

اِس تکلف بھرے الطاف کی جھوٹی ٹھنڈک
اور بھی اُن کے کلیجوں کو جلا جاتی ہے
پھول جب کرتے ہیں شبنم کی ضرورت محسوس
رات جاتے ہوئے کچھ اشک بہا جاتی ہے

کوئی موسم ہو یہ وجدانِ شدت کی جہک
صورتِ صبحِ ازل رقص کناں رہتی ہے
جملہ اسبابِ جہاں پر ہے تغیر حاوی
اک محبت ہے کہ ہر وقت جواں رہتی ہے

دَرد جس لَے میں نہ ہو، اُس کا اثر کیا ہوگا

مُجھ کو اِس صُورتِ حالات سے ڈر لگتا ہے

کوئی فریاد کی لَے یاد اگر ہو تو سُنا

اے مُغنّی مجھے نغمات سے ڈر لگتا ہے

رنج کی صُبح ہو یا شام ہو آسائش کی

مستقل برہم و ہموار چلی جاتی ہے

دائرہ ختم کہاں ہوتا ہے ارمانوں کا

زندگی صورتِ پرکار چلی جاتی ہے

بڑی دیر تک آگ روشن رہے گی
بڑی دُور تک برق لہرا رہی ہے
ترے جسم کی چاندنی اللہ! اللہ!
مجھے صبحِ تخلیق یاد آ رہی ہے

یہ کیوں رُک گئی نبض کون و مکاں کی
یہ کیوں تھم گیا چلتے چلتے زمانہ
کوئی آبگینہ گرا دو زمیں پر
نہ کوئی تبسّم، نہ کوئی ترانہ

کدھر حادثہ بچ کے نکلے گا کوئی
تماشے کی غارت گری چار سُو ہے
زمانے کی مصروفیت ختم گئی ہے
وہ بیٹھے ہیں اور آئینہ رُوبرو ہے

اِدھر ہم بھی کچھ کر رہے ہیں توقّف
اُدھر تم بھی کچھ سوچ فرما رہے ہو
قیامت کا بازار کیا گرم ہو گا
نہ ہم جا رہے ہیں نہ تم آ رہے ہو

اب مری حالتِ غمناک پہ کڑھنا کیسا
کیا ہوا مجھ کو اگر آپ نے ناشاد کیا
حادثہ ہے مگر ایسا تو المناک نہیں
یعنی اک دوست نے اک دوست کو برباد کیا

حال ہر طالبِ دیدار کا ہے ناگفتہ!
رنگ ہر صاحبِ ادراک کا فق ملتا ہے!
صرف ہم ہی نہیں اُس شوخ کے رہتے ہیں خراب
سینۂ عالمِ تحقیق بھی شق ملتا ہے

ہے محبت کی تڑپ میں وہ حلاوت پنہاں
بس کہ سرمایۂ ہستی کو بچائے نہ بنے
شہرِ انفاس کے جلنے کا قلق ہے لیکن
آگ ہے ایسی مقدس کہ بجھائے نہ بنے

پھر چکا چوند نہ پیدا ہوئی پہلے والی
پھر وہ مدہوشیٔ ادراک کا ساماں نہ ہوا
ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال
دوسری بار کوئی آئینہ حیراں نہ ہوا!

یہ جوانی کا مہکتا ہوا رنگیں موسم
یہ محبّت کا دمکتا ہوا اصلی سونا
آؤ سو جائیں خزاں آنے سے پہلے اک رات
کون دیکھے گا بہاروں کا پریشاں ہونا

ایسے ناشاد ہیں جیسے کوئی دُکھیا جوگن!
بن کے خمیازۂ ایّامِ بہار آئی ہے
زندگی میری نمعلوم خُوشی کے لمحے!
کِس سمن پوش کے کُوچے میں گزار آئی ہے

جیسے خود روسی کوئی چلتی ہوئی مست ہوا
جیسے بے ساختہ ہنستی ہوئی برسات کا رنگ
زندگی آج ہمیں ایسے ملی ہے ہنس کر
جس طرح چشمِ حسیناں میں مدارات کا رنگ

رات کے وقت نکلتی ہے جو ہونٹوں سے دُعا
اس میں خورشید کے سینے کی چبھن ہوتی ہے
کیا نئی بات ہے نکلا جو صدف سے گوہر
ہر اندھیرے میں نہاں ایک کرن ہوتی ہے

کیوں برتتے ہو میری جان تجاہل اتنا
کیا بہاروں کی پرستش مرا معمول نہ تھا
آپ جب صبحِ ازل مجھ کو ملے تھے ہنس کر
کیا مرے چاکِ گریباں میں کوئی پھول نہ تھا

ظاہری آنکھ نے جس ذرّے کو ناقص سمجھا
باطنی آنکھ کے معیار پہ وہ دھول نہ تھا
میں نے دیکھی ہے بگولوں میں جوانی تیری
لوگ کہتے ہیں بیاباں میں کوئی پھول نہ تھا

نظر اُس نے جب برملا ڈال دی

مری زندگی کی بنا ڈال دی

کیا ظلم بھی تو وہ کس ڈھنگ کا

شکستہ دلوں میں صدا ڈال دی

ارے الاماں ، الاماں ، الاماں

حبابوں کے اندر گلاب آ گیا

وہ پہلے ہی تصویر سے کم نہ تھے

مگر اب تو عہدِ شباب آ گیا

ارے ابروئے یار، میری بھی سُن
نہ شمشیر بن اور نہ صمصام بن
کوئی مستقل مرتبہ کر تلاش
کسی کی طبیعت کا آرام بن

•

غمِ زیست پر مسکرانا پڑا
ترے جبر کا گیت گانا پڑا
ارادہ تو نزدیک کا تھا مگر
بڑی دُور تک ہم کو جانا پڑا

وہ جو صہبا کشید کرتے ہیں
کیا خطائے سعید کرتے ہیں
پھینکتے ہیں کمند سورج پر
روشنی کو مرید کرتے ہیں

آخر کار نورِ دانش کو
زینتِ گیسوئے سیاہ کیا
میکدے میں وہ عمر ہاتھ آئی
مدرسے میں جسے تباہ کیا

پھول نے جب کہا میں یُوسف ہُوں
کاشِ یاقُوت ہے دہن میرا
میں نے پُوچھا کوئی ثبُوت اِس کا
ہنس کے بولا یہ پیرہن میرا

صحنِ مسجد میں ایک دو حاجی
دیں کی تکمیل کرنے آئے ہیں
صف چُرا کر جو لے گئے تھے کبھی
اُس کو تبدیل کرنے آئے ہیں

آدمی کے عمل ہیں جو اُس کو
صاحبِ مرتبہ بناتے ہیں
موت اور رزق وہ تو مجبوراً
وقت پر اپنے آہی جاتے ہیں

ساحلِ جُو کے سُنبل و ریحاں
حسرتِ زندگاں کے ڈیرے ہیں
پاؤں آہستہ رکھ کہ رستے میں
دردمندوں نے دِل بکھیرے ہیں

اِتفاقاً کبھی جو یار ملیں
صُورتِ بر بط و بہار ملیں
یاد کر لیں ہمیں بھی بھُولے سے
ایسے موقعے اُنھیں ہزار ملیں

بط سے ماہی نے جب کہا جل کر
کیا ہو گر جُوئے تن میں آب آئے
بط لگی کہنے جب کباب ہیں ہم
پھر سراب آئے یا حباب آئے

جاگ ساقی کہ حجلۂ شب میں
ایسا کنکر سحر نے مارا ہے
جامِ درویش کی بساط ہی کیا
جامِ سُلطاں بھی پارا پارا ہے

یُوں خرابات کا طواف نہ کر
بادہ نوشوں پہ ہاتھ صاف نہ کر
یہ رہِ مُخلصانِ مقصد ہے
اس میں اِخلاص کے خلاف نہ کر

شیخ صاحب سُنا ہے جنّت میں
شاہد و مُطرب و سبُو ہوں گے
ہم تو خیر ایک رندِ کہنہ ہیں
آپ کس طرح سُرخرو ہوں گے

یار! خیّام اگر شرابی ہے
ہمدمِ چہرۂ کتابی ہے
زندگی ہی نہیں تری سرخوش
آخرت بھی تری گلابی ہے

سوا اس کے ہو گی وہاں اور شے کیا
ہوائے نشاطِ خرابات ہو گی!
جسے صبحِ محشر سمجھتی ہے دُنیا
خوشی کی کوئی بے وفا رات ہو گی

ہزار خوابِ حسیں جب تباہ ہو جائیں
تو پھر کہیں کوئی تعبیر خواب ملتی ہے
دکھائی دُور سے دیتے ہیں جانفزا چشمے
قریب جاؤ تو موجِ سراب ملتی ہے

بڑے سکوں سے پہنچ جائیں گے کنارے پر
بڑا سبک نظر آتا ہے اب سفر اپنا
سفینہ غرق ہُوا بھی تو کس جگہ ہو گا؟
ہوا درست، خدا مہرباں، بھنور اپنا

صراحی کے روشن ستاروں کے اندر
مقدّر کے کتبے رقم دیکھتے ہیں
کتابوں سے یہ شے نہیں ہاتھ لگتی
پیالوں میں احوالِ جم دیکھتے ہیں

مجھے زیرِ سایہ بسر کرنے دیجے
پرندوں کی مانند مسرور ہو کر
مجھے آزمائش میں مت ڈالئے گا
میں مر جاؤں گا آپ سے دُور ہو کر

غموں کے اندھیرے بڑے بیکراں ہیں
چراغِ مئِ رُوح پرور جلا دو
اگر روتے روتے بہت تھک گئے ہو
تو اے رونے والو! ذرا مُسکرا دو

معجزہ کوئی ایسی چیز نہیں
حسن اگر دستگیر ہو جائے
ضربِ تیشہ پڑے اگر گہری
کیا خبر جوئے شیر ہو جائے

جب تک رگوں میں خون کی گردش ہے موجزن
مفہوم زندگی ہے یہ چھنن چھن چھنا چھنن
نکلی نہ جوئے شیر تو کیا، اس قدر تو ہے
سنتا رہا سرودِ رگِ کوہ۔ تیشہ زن

مُسلّمہ ہے سکُوتِ ادب کی حدّت کا
اُبال کھا کے نوائے سروش ہو جانا
مرا خیال ہے معراج ہے شکایت کی
ترے حضُور ہمارا خموش ہو جانا

ہر تجلّی کو آنکھ سے چُوما
ہر حسیں چیز سے محبّت کی
اے خُدا تُجھ کو ڈھونڈنے کے لئے
ہم نے پتھر کی بھی عبادت کی

اُف جوانی کی یہ چھب اور تجلّی کا ہجُوم
رنگ کے ساتھ تمازت کی فراوانی ہے
آنکھ کو مے میں بھگو لوں تو کروں جرأتِ دید
مہ جبینوں کے رُخوں پر بڑی تابانی ہے

حیات کے اِسی تپتے ہُوئے بیاباں میں
مقام ایک عجیب و غریب آتا ہے
عدم ملول نہ ہو اُس کی سرد مہری سے
اِس امتحاں میں کوئی خُوش نصیب آتا ہے

وہ گمرہی کے اندھیروں کی آخری حد تھی
جہاں سے ایک حسیں راستہ طلوع ہوا
محبّت اس طرح جاگی عناصرِ دل میں!
کہ جیسے دل میں شعورِ خدا طلوع ہوا

ترے شعور سے اسرارِ غیب ہیں روشن
ترے وجود سے تزئینِ کائنات تو ہے
تری ہی ذات ملائے گی ہم کو یزداں سے
خدا کی ذات نہیں ہے تو تیری ذات تو ہے

مرا خیال تھا تھوڑی سی روشنی ہوگی
مگر ضیا کی جگہ بیکراں اندھیرا تھا
پہنچتا کیسے میں بر وقت اپنی منزل پر
کہ راستے میں مجھے رہبروں نے گھیرا تھا

ضرورتیں تو بڑی زندگی میں ہوتی ہیں
مگر طلب کو خوئے التجا نہیں آئی
اٹھا تو ہوگا کئی بار دستِ مجبوری
ستم ظریف کو لیکن دعا نہیں آئی

بادِ مُراد چل پڑی، رُوحِ طرب مچل پڑی
ساز و سبو کھنک پڑے، دَور میں جام آگیا
دیکھ کے رُوئے یار پر عالمِ کاکلِ جواں
چہرۂ آفتاب پر دامنِ شام آگیا

جو بھی صِلا ملا اُسے، لے کے بڑے غرور سے
عشق نصیب آزما، کر کے سلام آگیا
منزلِ کُوئے دوست کے دو ہی تو ہیں فقط نشاں
یا کوئی تیر لگ گیا۔ یا کوئی جام آگیا

بربادی تو اک سونا ہے اُس کی چمک کو کیوں کھونا

کیوں بیکار بھریں آہیں، کیوں بے صرفہ فریاد کریں

کیسی محبت، کیسی چاہت ہم پر سب کچھ روشن تھا

یُونہی ذرا یہ شوق ہُوا تھا آؤ دل برباد کریں

دے جام میں بھر کر آگ کہ میکش بزم سے اُٹھنے والے ہیں

گا کوئی دل افگن راگ کہ میکش بزم سے اُٹھنے والے ہیں

کیوں نیند سے گرتا جاتا ہے، باقی ہے بہت سی رات ابھی

بد قسمت ساقی جاگ کہ میکش بزم سے اُٹھنے والے ہیں

آپ عبث کیوں گھبراتے ہیں
کھیل ہے کوئی دام نہیں ہے
دل کا تماشا دیکھ رہے ہیں!
آپ سے کوئی کام نہیں ہے

ترا ذکر اتفاقاً، ترا نام بے ارادہ
یہ حدیثِ بے تمنا، وہ کلام بے ارادہ
مری اِک صفت خدا کو یہ بڑی پسند آئی
مری جتنی لغزشیں تھیں وہ تمام بے ارادہ

روز کس کو نصیب ہوتی ہے
چاندنی شب کے آبگینے کی
محتسب آج اعتراض نہ کر
چودھویں رات ہے مہینے کی

اے رفیقانِ قدح آشام و درخشندہ ضمیر!
حشر کے دن بھی ہوائے کامرانی آئے گی
میکشوں کے پاؤں لینے کو بڑھے گی موجِ مے
شاعروں کے خیر مقدم کو جوانی آئے گی

مٹی کی مونالیزا

اے حمید

جتنے خوبصورت افسانے اے حمید نے لکھے ہیں۔ کم کسی نے لکھے ہونگے ۔ساری ہی رومانی فضا، سارے ہی رومانوی کردار۔یہ خاصہ صرف انہی کے افسانوں میں ملے گا۔ مٹی کی مونا لیزا، اے حمید کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا ایک ایک افسانہ، دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ لکھا گیا ہے اور دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

ادارہ فروغ اردو - لاہور

رات چور اور چاند

آج تک اردو میں کل تین چار ہی تو قابل ذکر
ناول لکھے گئے - ان میں اب جا کر ایک اور
معرکے کے ناول کا اضافہ ہوا ہے - جسے

بلونت سنگھ

نے لکھا ہے - یہ ناول قسط وار نقوش میں شائع ہوتا رہا ہے۔
جس کی دھوم مچی ہوئی ہے - اس لئے کہ اس میں بلونت سنگھ
کا فنِ عروج پر ہے - جزئیات نگاری بلونت سنگھ پر ختم ہے
پنجاب کی زندگی کا بھرپور نقشہ جیسے بلونت سنگھ نے پیش
کیا ہے - وہ بھی انہی کا حصہ ہے -
جس ناول کی عرصے سے مانگ تھی - وہ اب چھپ گیا ہے -

قیمت سات روپے

ادارۂ فروغ اردو لاہور